Rizwan Ullah
D-178, Abul Fazl Enclave-I
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Tel: +91-9971283786, 9891832189
Email:ruilmi@rediffmail.com
Web: www.Rizwanullah.com

برسبیل تذکرہ

رضوان اللہ

ادھر کچھ عرصہ سے پڑھنے لکھنے کا سلسلہ بوجوہ رک سا گیا تھا۔ کئی مہینے قبل میں اپنی تصنیف ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' پر غور کرنے لگا پھر اپنی ہی تصنیف پر کچھ تبصرے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھ کر کچھ لکھنا شروع کیا تو بات پھیلتی گئی اور نوبت آٹھ دس کتابوں پر سرسری تبصرے تک پہنچی تو اس کے لیے ''کتب صحافت کی بازدید'' کا عنوان تجویز کیا۔ مضمون طویل ہو گیا تھا اس لیے اس کو اپنی ویب سائٹ پر ڈال کر چھوڑ دیا پھر جمود و سکوت کی چادر اوڑھ لی۔ کئی مہینے اسی کیفیت میں گزر گئے کہ شاہد الاسلام صاحب نے اپنی تصنیف ''دہلی میں عصری اردو صحافت تصویر کا دوسرا رخ'' ارسال کر دی۔ اس کے ہاتھ لگتے ہی میں نے جمود کی چادر سے باہر جھانکا۔ اس کیفیت نے اشہب قلم کو مہمیز کیا۔ خیال ہوا کہ کیوں نہ سب سے پہلے اپنی غریب اور عجیب بھی، صحافت کے دفاع میں کچھ عرض کروں۔ اس کتاب کو دیکھنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اردو اخبارات ''سرقہ'' کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔ ابتک تو میں اردو اخباروں کی اسی تحقیر سے واقف تھا کہ ان کی زندگی ترجمہ کی مرہونِ منت ہے۔ ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تعداد اشاعت بیان کرنے میں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔

میرا پہلا سوال یہ ہے کہ دنیا کی کونسی صحافت یا اخبار ایسا ہے جو ترجمہ کے بغیر چلتا ہے۔ کیا پیکنگ، ماسکو یا ٹوکیو سے ساری خبریں انگریزی یا ہندی میں موصول ہوتی ہیں یا ترسیل اور موصولی کے دونوں سروں پر کہیں نہ کہیں ان کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے اخباروں میں پی ٹی آئی سے موصول ہونے والی خبروں کا انگریزی سے اردو میں سارے کا سارا ہر روز ترجمہ کیا جاتا تھا۔ یو این آئی کی اردو سروس شروع ہو جانے کے بعد یو این آئی کی خبروں کا ترجمہ ہمارے دفتروں کے بجائے ان کے دفتروں میں ہونے لگا۔ اس خوش گوار ترقی کے بعد ہمارے سیکڑوں مترجم مدفاضل ہو گئے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی مہربانی سے اردو کمپیوٹر بھی فراہم کر دیے گئے تو یہ کام اور بھی آسان ہو گیا۔ چلئے صاحب اس ترقی نے پھر سیکڑوں کاتبوں کو رخصت کا پروانہ دے دیا جو دو سو برس سے اردو صحافت کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لیے پھرتے تھے۔

چند باتیں کاتبوں کے متعلق عرض کرنی ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ اکثر ان کا ذکر بہت سرسری طور پر کیا جاتا

ہے جو کہ حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ دراصل ان میں سے اکثر و بیشتر اچھی علمی صلاحیت رکھتے تھے اور دینی علوم سے کبھی بہرہ ور تھے۔ ان میں سے کتنے ہی شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور ناول نگار تھے۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ میں نے اپنی تصنیف ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' میں بطور خاص کیا ہے۔ دراصل ہمارے دینی مدارس میں مختلف دستکاریوں اور فنون اور پیشوں کی بھی تعلیم دی جاتی تھی مثلاً خطاطی، خیاطی (ٹیلرنگ) چرم سازی، جلد سازی، حفظ و قرأت وغیرہ چنانچہ کتنے ہی کاتب حضرات عالم، فاضل، حافظ، قاری ہوا کرتے تھے۔ دوسری طرف المیہ یہ تھا کہ ان کی قدر شناسی نہیں ہوئی کیونکہ وہ بہ آسانی دستیاب تھے یہی وجہ تھی کہ جس نے ایڈیٹر بننے کا خواب دیکھا برائے نام قیمت پر اس خواب کی تعبیر خرید لی۔ یہی آسانی اور لیتھو پریس کی سہولت اور کم خرچ نے کم و بیش دو صدیوں تک اردو صحافت کا چراغ روشن رکھا۔ اتنا ہی نہیں یہی سبب ہوا اس برصغیر کے گوشے گوشے میں اردو صحافت کی رسائی اور سمائی کا جو کسی اور زبان کی صحافت کو نہیں نصیب ہوئی۔

اب رہی ''سرقے'' کی بات۔ مجھے نہیں معلوم کہ سرقے کی تعریف اور اس کے حدود اربعہ کیا ہیں۔ میں تو صرف ادب میں روایا ناروا سرقے کی بات سنتا آیا تھا اس کا رواج شاید ہر زبان کے ادب میں رہا ہے۔ چند سال قبل معلوم ہوا کہ ایک برطانوی وزیر نے جنگ عراق کا ایک قابل ستائش منصوبہ پیش کیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سرقہ تھا۔ کسی ریسرچ اسکالر نے وہ مقالہ لکھا تھا اور اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر اسے انٹرنیٹ پر دے دیا تھا۔ وزیر بے تدبیر نے اس سے بھی بڑی ناتجربہ کاری کا اظہار کرتے ہوئے سارے کا سارا مقالہ من وعن اپنے نام سے منسوب کرلیا بالآخر ان کی اس جسارت کے انکشاف کے بعد انھیں وزارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ گویا یہ سرقے کی جدید ترین قسم تھی لیکن سوال اصل یہ ہے کہ انٹرنیٹ سے لی جانے والی ساری چیزیں سرقے میں شمار کی جاسکتی ہیں یا نہیں۔ اب تو بیشتر اخبارات بھی انٹرنیٹ پر موجود ہوتے ہیں۔

ہر زبان کے اخبارات ایک دوسرے کے مواد کا کسی نہ کسی شکل میں لین دین کرتے رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ مواد کے ساتھ کبھی حوالہ درج ہوتا ہے کبھی نہیں۔ میرے خیال سے اسی دوسری صورت کو اخباروں میں سرقہ کا نام دیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے بعض چھوٹے چھوٹے اخبارات اس کمزوری کے مرتکب ہوتے رہے ہیں لیکن اس کا اطلاق سب پر کرنا انصاف سے بعید ہوگا۔ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ بڑے بڑے اخباروں کے نامہ نگار بڑے بڑے ملکوں کی راجدھانیوں، جیسے کہ لندن، واشنگٹن، پیرس، ماسکو وغیرہ، میں مامور ہوتے ہیں وہ وہاں کے اخباروں کی اہم خبروں اور مضامین میں لفظی الٹ پھیر کر کے اپنے اخباروں کو بھیج دیتے ہیں اس طرح وہ سرقہ کے بجائے اوریجنل رائٹنگ کے طور پر چھپ جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جو چیزیں انٹرنیٹ پر غیر مشروط طور پر ڈال دی جاتی ہیں ان کے اقتباس کو سرقہ قرار دینا درست نہیں ہے۔

لگے ہاتھ تعداد اشاعت کی بات بھی کرلی جائے۔ تعداد اشاعت میں مبالغے سے کسی کا دامن پاک نہیں ہے۔ ہمارے اخبارات غریب ہیں یہ مبالغہ بھی ہزار میں کرتے ہیں لاکھ میں مبالغہ کرنے کی ان میں جسارت نہیں اور صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح ثابت کرنے کے لیے جن مادی وسائل کی اور جس مقدار میں ضرورت ہوتی ہے وہ ان کے بس

سے باہر ہے۔ پھر تعداد اشاعت اور ریڈرشپ دونوں الگ الگ باتیں ہیں سرکاری اعداد وشمار میں اس کی وضاحت نہیں کی جاتی۔ مجھے کلکتہ میں آزاد ہند سے وابستگی کے زمانے کا ایک واقعہ یاد ہے۔ اشتہار دہندگان کے کسی ادارے نے اردو اخباروں کی ریڈرشپ کا ایک سروے کرایا تھا۔ اس سروے کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ ایک اردو اخبار کو اوسطاً تیرہ آدمی پڑھتے ہیں۔ ہم ابھی اس کے اسباب سے بحث نہیں کر رہے ہیں لیکن اس نتیجے کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی اخبار کی اشاعت دس ہزار ہے تو اس کے قاری کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار ہوئی۔ اصل اہمیت قاری کی ہے نہ کہ تعداد اشاعت کی۔

احتجاج کی آواز:

ہمارے اخباروں پر یہ الزام کم وبیش ہر تحریر میں دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہ ہر وقت صرف احتجاج کیا کرتے ہیں۔ فوری طور پر کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں، جب ناانصافیاں سلسلہ در سلسلہ جاری ہوں اور انصاف نہ ملتا ہو جس کی بیشمار مثالیں ہیں تو کیا ہمارے اخبارات احتجاج کرنے سے بھی گئے؟ ٹی وی چینل کسی معمولی سی خبر کو لے کر ۲۴ گھنٹے اس کو پیٹتے رہتے ہیں تو کیا وہ کم قابلِ اعتراض ہے؟ اپنے قاری کی آواز جہاں تک پہنچا سکیں یہ اخبارات بھی نہیں پہنچائیں گے تو کون یہ کام کرے گا؟ ''نام نہاد نیشنل پریس'' ان کے واقعی مسائل کو بالکل بلیک آؤٹ کرتا ہے۔ میں نے ''نیشنل پریس'' کو نام نہاد اس لیے کہا کہ یہ ایک گمراہ کن اصطلاح ہے۔ کیا صرف نصف درجن انگریزی کے اور اتنے ہی ہندی اخبارات کا نام نیشنل پریس ہے؟ صرف ایک مرکز سے ایک ہی اشاعت میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا بنگلہ اخبار کیا نیشنل پریس نہیں ہے؟ ایسا ہی معاملہ جنوبی ہند کے اخباروں کا ہے۔ اگر نیشنل پریس ایک بہت بڑا دائرہ ہے تو ساری زبانوں کے پریس ان کے چھوٹے بڑے قوس یعنی ٹکڑے ہوئے تو کیا اردو پریس اس کا ایک چھوٹا سا حصہ نہیں ہے۔ ایسی اور بھی خود ساختہ گمراہ کن اصطلاحات زبان زد ہیں۔

بنیادی حقیقت یہ ہے کہ اردو صحافت اپنے وجود کی ابتدا سے ہی احتجاج کی آواز رہی ہے بلکہ یہ احتجاج کی پیداوار ہے۔ راجہ رام موہن رائے نے سماجی برائیوں کے خلاف احتجاج کے لیے جامِ جہاں نکالا۔ اس احتجاج کے نتیجے میں ہندو سماج ستی کی لعنت سے پاک ہوا۔ ان کی بیواؤں کو زبردستی کی ہلاکت سے نجات ملی۔ دہلی اردو اخبار کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر کو احتجاج کی پاداش میں جان عزیز کی قربانی پیش کرنی پڑی جو ہندوستان کی صحافت کی تاریخ کا واحد اور بے مثال واقعہ ہے۔ ہمدرد، ملت، الہلال اور بھی کتنے ہی زیرِ عتاب آنے والے اخبارات اسی احتجاجی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ احتجاج ایک خوبی ہے، خرابی نہیں۔ یہ درست ہے کہ ہر کام میں اعتدال چاہیے۔ افراد مختلف اسباب یا منفعتوں کے پیش نظر اعتدال کی حدوں سے گزر جاتے ہیں اور ہماری صحافت کی عظیم میراث کو داغدار کرتے ہیں۔

احتجاجی صحافت کے بارے میں ایک بات اور قابلِ ذکر ہے۔ وہ اخبارات جو تقسیم کے بعد پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے وہ جالندھر اور دہلی میں خیمہ زن ہوئے۔ ظاہر ہے رفیوجی کی حیثیت سے انھیں رہائش، معاش، معاشرت، کاروبار کے زبردست مسائل کا سامنا تھا۔ ان اخباروں کو بھی اپنی طرح کے مسائل کا سامنا تھا۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی طرف سے ہر طرح کی امداد واعانت، عوام کی طرف سے بھی ہمدردی کے باوجود ان کے

مسائل آسانی سے اور کم عرصے میں حل ہونے والے نہیں تھے۔ ان اخباروں کی اور ان کے مہاجر قارئین کی زبان اردو تھی۔ ان اخباروں میں سے ہند سماچار، پرتاپ، ملاپ، اجیت جالندھر میں قیام پذیر ہوئے، پرتاپ اور ملاپ نے دہلی میں شاخیں قائم کیں اور انہی کو مرکزی حیثیت دی، ملاپ نے ایک ایڈیشن حیدرآباد سے بھی نکالا۔ ان اخباروں کو اپنے اور اپنے قاری کے اور عام رفیوجیوں کے مسائل کو اٹھانے کے لیے مسلسل احتجاج کی راہ اختیار کرنی پڑتی تھی لیکن شاید کسی نے بھی ان کے اس رویہ کو احتجاج کا نام نہیں دیا بلکہ ان کے جائز مطالبات کا اظہار قرار دیا۔ آخر کیوں؟ دونوں طرح کی احتجاجی تحریروں کے درمیان امتیاز کیوں؟ ہمارے اخباروں کے قاری کے مسائل کچھ کم سنگین نہیں ہیں۔ وہ عظیم الشان ماضی کی چادر میں منہ لپیٹ کر ذرا تسکین حاصل کرتا ہے تو اسے فرسودہ خیالی کا نام دیا جاتا ہے۔ اللہ کے ان بندوں سے کسی قدر ہمدردی کی ضرورت بھی ہے۔

کچھ ایسا ہی معاملہ سابق مشرقی پاکستان سے بنگال اور آسام میں آنے والے رفیوجیوں کا ہوا۔ فرقہ وارانہ فسادات تو کہیں تھمنے ہی کو نہیں آتے تھے لیکن اُس طرف کسی معمولی سے فساد کے بعد بھی رفیوجیوں کی آمد کا تانتا بندھ جاتا تھا۔ ہماری طرف کے بنگلہ اخبار اس توے پر خوب روٹیاں سینکتے لیکن اسے نہ کبھی مبالغہ کہا گیا نہ احتجاج۔ پھر آخر ہمارے اخبارات جب اپنے قاری کے دکھ درد سے دنیا کو باخبر کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو انھیں متہم کیوں کیا جاتا ہے؟ خدارا انصاف کیجیے! ہاں یہ بات درست ہے کہ عیب کے لیے بھی ہنر چاہیے جس کا فقدان ہے۔

ذکر قومی آواز کا:

قومی آواز بلاشبہ اردو کا ایک معتبر اور متوازن اخبار تھا لیکن افسوس کہ ہمارا پریس نئی ترقیوں سے ابھی پوری طرح بہرہ مند نہ ہوسکا تھا کہ قومی آواز کا چراغ گل ہوگیا۔ ایسوسی ایٹڈ جرنلس کی ملکیت میں ہونے کی وجہ سے قومی آواز کو نہرو گھرانے اور حکومتوں کی بھرپور پشت پناہی حاصل تھی۔ حیات اللہ انصاری نے اس میں صحافتی معیار کی بنیاد قائم کی تھی۔ زبان کے اعتبار سے لکھنؤ کا مزاج و ماحول بھی حسبِ حال تھا۔ انصاری صاحب کے بعد یہ ساری صحافتی میراث عشرت علی صدیقی کے حصے میں آئی۔ ان کے علاوہ بھی قومی آواز میں کئی اعلیٰ پایہ کے تجربہ کار صحافی موجود تھے۔ قومی آواز کی خوبیوں میں یقیناً ان کی کاوشوں کا بھی دخل رہا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ کوئی اخبار سارے کا سارا کسی فردِ واحد کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

ایمرجنسی کے زمانے میں صدیقی صاحب نے لکھنؤ میں ایک ملاقات کے دوران مجھے بتایا کہ گورنر نے ایک بار مجھے طلب کیا تھا، میں نہیں گیا اور انھیں جواب دیا کہ سیاست میں میں آپ سے سینئر ہوں۔ اس لیے اگر ملنا ہو تو آپ کو آنا چاہیے۔ ایمرجنسی کے زمانے میں بڑوں بڑوں کا حال تو یہ تھا کہ بقول شخصے ''ان سے جھکنے کو کہا جاتا تو وہ پاؤں پر گر جاتے تھے'' مغربی بنگال کے وزیرِ اعلیٰ سدھارت شنکر رے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ''اندرا ہی انڈیا ہیں۔'' ایسے میں صدیقی صاحب کی وہ جسارت صرف نہرو گھرانے کی پشت پناہی کی بنا پر رہی ہوگی۔

قومی آواز لکھنؤ میں جن جید صحافیوں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے انھیں صدیقی صاحب کے دورِ اقتدار میں ابھرنے کا موقع نہیں ملا۔ وقت گزرتا گیا اور صدیقی صاحب کسی لامتناہی مدت تک نہیں ٹھہر سکتے تھے چنانچہ ایسوسی

اٹیڈ جرنلس کے لیے موہن چراغی کو ان کا جانشین بنانے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ اس وقت سرینگر میں نیشنل ہیرالڈ کے نامہ نگار تھے۔ انھیں افسوس تھا کہ انگریزی صحافت سے اردو صحافت میں کیوں آئے۔ دراصل ان کا فیصلہ غلط نہیں تھا لیکن سوءاتفاق سے وقت نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ قومی آواز کے برے دن آ گئے جس کے اسباب بہتیرے تھے۔ کارکن اپنے مطالبات کو لے کر عدالت میں پہنچ گئے، منتظمین نے ان سے مصالحت کی راہ نہیں اختیار کی۔ عدالتی فیصلے کے مطابق واجبات کی ادائیگی میں ادارے کے اثاثے نیلام ہوگئے۔ اردو صحافت کا بلاشبہ بڑا نقصان ہوا لیکن کانگریس کو ایک سیاسی پارٹی کے طور پر بھی کچھ کم نقصان نہیں ہوا۔ پارٹی کے مشیروں نے بڑی ناعاقبت اندیشی سے کام لیا۔ کانگریس کے لیے قومی آواز کی اشاعت پھر شروع کرنے کا ابھی اچھا موقع ہے کیونکہ یوپی کی ریاستی اسمبلی کے انتخابات عنقریب ہونے والے ہیں۔

لکھنؤ کے بعد دہلی سے قومی آواز کا ایڈیشن نکلا۔ پٹنہ سے بھی ایک ایڈیشن نکلا لیکن ابتدا سے ہی وہ کافی کمزور نظر آ رہا تھا جلد ہی بند ہوگیا۔ سری نگر اور بمبئی ایڈیشن نکالنے کی اسکیم تھی لیکن اس پر عمل نہیں ہوسکا۔ سرینگر میں وتل صاحب کا روزنامہ ''خدمت'' کانگریس پارٹی کی خدمات انجام دے رہا تھا اس لیے شاید قومی آواز کا وہاں اجراء غیر ضروری سمجھا گیا ہوگا۔ بمبئی میں انقلاب اور اردو ٹائمز کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوتا غرضیکہ وہ اسکیمیں رہ گئیں۔

محدود وسائل:

کسی اخبار کی تعداد اشاعت کچھ بھی ہو اس سے آمدنی کافی نہیں ہوسکتی۔ اصل آمدنی اشتہارات سے ہوتی ہے۔ اس کے دو بڑے وسائل ہوتے ہیں ایک سرکاری اور دوسرے تجارتی اور صنعتی ادارے۔ ان دونوں وسائل کا بڑا حصہ بڑے بڑے اخبارات کو مل جاتا ہے ہمارے اخباروں کے حصے میں ''بقدرِ اشکِ بلبل'' آتا ہے۔ تاہم کہا جاسکتا ہے کہ حکومتوں، نیم سرکاری اور مقامی اداروں سے بلا کسی خاص زحمت کے انھیں اتنا مل جاتا ہے کہ ان کی گاڑی چلتی رہتی ہے لیکن اس کے آگے بڑھ کر وہ کچھ نہیں کرتے مثلاً اشتہارات کی فراہمی کے لیے کمیشن ایجنٹوں کی خدمات حاصل کرنا، خود اپنے اخبار کی پبلسٹی کرنا، جبکہ آج بڑے بڑے اخباروں کو بھی اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ اس سلسلے میں طرح طرح کے اقدامات کرتے ہیں۔ میں نے ایک بار موہن چراغی، ایڈیٹر قومی آواز کی توجہ اس طرح دلائی تھی تو ہمارے اوکھلا کے علاقے میں، ممکن ہے پرانی دلی کے اردو بولنے والے علاقوں میں بھی، قومی آواز کی ہورڈنگ نظر آتی تھی۔ اس بے عملی کا الزام خود ان اخباروں پر عائد ہوتا ہے۔

جہاں تک اسٹاف کا تعلق ہے ٹیکنالوجی کے پیہم انقلابات نے ان کا کام بہت آسان کر دیا ہے۔ ایک بار پریس کمیشن کے اجرتی بورڈ کے ایک رکن کو کلکتہ کے ایک ایڈیٹر صاحب نے جو اخبار کے مالک بھی تھے بتایا تھا کہ وہ تنہا سارے کام کر لیتے ہیں، اس لیے مزید عملے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ جب عملے کی ضرورت ہوا کرتی تھی تب بڑے لائق اور کارآزمودہ صحافیوں کے ساتھ نہایت غیر مہذب سلوک کیا گیا، دراصل وہ زمیندارانہ اور جاگیردارانہ مزاج اور ذہنیت کا نتیجہ تھا جس کی وجہ سے وہ ان دانشوروں اور کھیت کھلیان میں کام کرنے والی رعایا کے درمیان تمیز نہیں کر سکے۔

بے چہرگی:

صاحب تصنیف اور حقانی صاحب بھی ہمارے اخباروں کی بے چہرگی کے شاکی ہیں لیکن جب مسلم مسائل کو اٹھاتے رہنے پر اصرار، ان کے ساتھ ناانصافیوں کے خلاف مسلسل احتجاج، مسلم قارئین کی مذہبی، تاریخی اور معاشرتی دلچسپیوں کے مضامین ہر ممکن طریقے سے تلاش کر کے وہ پیش کرتے رہے ہوں تو انھیں بے چہرہ کیسے کہا جا سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ جو چہرہ پیش کر رہے ہیں وہ کبھی رخ روشن سے تعبیر کیا جاتا تھا لیکن تقسیم وطن کی مار نے اس چہرے کو ایسا مسخ کر دیا کہ اس کی شناخت باقی نہیں رہی۔ چنانچہ ایک طرف ایک خاص چہرہ دکھاتے رہنے کی تہمت اور دوسری طرف بے چہرگی کا طنز مجھے تو ان دونوں باتوں میں تضاد نظر آتا ہے اور اس سے اتفاق کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ دراصل کسی اخبار کے قاری کا جو چہرہ ہوتا ہے وہی اخبار کا اصل چہرہ ہوتا ہے۔ اسے شائع کرنے والا خواہ کوئی ہو وہی چہرہ پیش کرتا ہے۔ ہماری اردو صحافت کا جو چہرہ ہے اور جیسا بھی ہے وہی راشٹر سہارا پیش کرتا ہے، انقلاب بمبئی اور آزاد ہند کلکتہ کے نئے مالکان وہی چہرہ پیش کرتے ہیں جو ان اخباروں کے سابق مالکان پیش کیا کرتے تھے۔

شاید ایک مثال بھی بے محل نہیں ہوگی۔ وسیم الحق نے ۱۹۸۰ء کے عشرے میں کلکتہ سے روزنامہ اخبار مشرق کی اشاعت شروع کی تو پہلے ہی شمارے میں اعلان کر دیا کہ مسلم مفادات کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کی جائے گی۔ ریاست مغربی بنگال میں مارکسی کمیونسٹ پارٹی کی حکومت تھی۔ ایک وقت ایسا آ گیا کہ پارٹی ورکروں نے ان کے دفتر پر حملہ کر دیا، خود وسیم صاحب بھی زخمی ہوئے لیکن اخبار کا وہ چہرہ جس کا اعلان انھوں نے روزِ اول کر دیا تھا اس پر میل نہیں آنے دی۔ آج اخبار مشرق کے دہلی اور رانچی ایڈیشن بھی نکل رہے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چہرہ جیسا بھی ہے سامنے ہے، بے چہرگی بہر حال نہیں ہے۔

''دہلی میں عصری اردو صحافت، تصویر کا دوسرا رخ'' دراصل شاہد الاسلام کے ایک تحقیقی مقالے کا عنوان ہے۔ بعد میں اسی مقالے کو موجودہ کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ مصنف کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنے خیالات کو ترتیب دے اور ان کی اشاعت کرے لیکن اگر بات تحقیق کی ہو تو پھر بعض تلازمات کا لحاظ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر دو اخباروں میں موازنے کی بات۔ ایک اخبار کا تعلق کارپوریٹ ادارے سے ہے دوسرے کا نہیں۔ کارپوریٹ ادارے کی پشت پناہی سے چلنے والا دوسرا اخبار بھی تو تھا موازنہ دراصل انہی دونوں کے درمیان کیا جانا چاہیے تھا۔ میری مراد راشٹریہ سہارا اور انقلاب سے ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہفتے میں دو ضمیموں ''دستاویز'' اور ''امنگ'' ان کے علاوہ ہفتہ وار عالمی سہارا اور ماہنامہ مرحوم بزمِ سہارا کے ساتھ راشٹریہ سہارا کو موازنے میں شامل کیا جائے گا یا ان کے بغیر۔ میرے خیال سے یہ نکات قابلِ لحاظ ہیں۔ مزید یہ کہ معرکۃ الآرا ''بزمِ سہارا'' اور ہفتہ وار ''عالمی سہارا'' کی شمعیں روشن کرنے کے لیے حقانی القاسمی نے جو خون جلایا اس کے لیے کیا ان کا اتنا حق بھی نہیں تھا کہ راشٹریہ سہارا کے ذیل میں سہی اس کا اعتراف کیا جاتا۔

موازنے کے ضمن میں ہی چند مثالیں پیش کر کے میں اپنی بات ختم کرنا چاہتا ہوں۔

پہلا واقعہ:

۲۲؍نومبر ۱۹۶۳ء امریکہ میں صدر کینڈی قتل کر دیے گئے۔ یہ ایک بڑا سانحہ تھا۔ دنیا بھر میں اخبارات اور دیگر نشری وسائل کے لیے سب سے بڑی خبر تھی۔ اسی روز ہمارے ہاں بھی ایک بہت بڑا قومی سانحہ ہوا۔ کشمیر میں ایک فوجی ہیلی کوپٹر حادثہ کا شکار ہو گیا۔ اس میں پانچ جنرل سوار تھے۔ وہ سب ہلاک ہو گئے۔ ہندوستانی افواج کے لیے اور پورے ملک کے لیے یہ ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت ہمارے اخباری دفاتر میں جو صحافی ایک ذمہ دار کی حیثیت سے نیوز ڈسک پر موجود تھا وہ ان دونوں بیچ اسپریڈ سرخیوں میں سے کس کو اول اور کس کو دوسری خبر بنائے۔ اس وقت کئی باتوں پر فیصلے کا دارومدار تھا۔ نیوز ایڈیٹر کو یہ خبریں کس وقت موصول ہوئیں۔ اس کی آخری کاپی کس مرحلے میں تھی۔ اس کا اخبار انگریزی یا اردو تھا۔ انگریزی اخبارات کے پاس اپنے ٹیلی پرنٹر تھے، اردو اخبارات اس سے محروم تھے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا تھا کہ کچھ اخبارات پی ٹی آئی کی سروس لیتے تھے، وہ نیوز سروس بھی لے کر نیوز ایجنسی کے کوریئر گھنٹے گھنٹے بھر کے وقفہ سے آتے تھے۔ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ خبروں کی دنیا میں جہاں منٹوں اور سکنڈوں کا حساب ہوتا ہے ایک گھنٹے کا فاصلہ کیا معنی رکھتا ہے۔ مزید براں فصلِ زمانی کے علاوہ فصلِ مکانی بھی تھا یعنی مثال کے طور پر جو خبر دہلی کے اخباروں کو پی ٹی آئی کے ذریعہ ملتی تھی وہی خبر کلکتہ کے اخباروں کو تقریباً ایک گھنٹے بعد موصول ہوتی تھی چنانچہ کلکتہ کے اخباروں کے مقابلے میں دہلی کے اخبارات زیادہ دیر تک یعنی تازہ سے تازہ ترین خبروں کو کور کر سکتے تھے۔ ان نزاکتوں کو سمجھ لینے کے بعد اصل صورتِ حال پر نظر ڈالیں۔

میں اس واقعہ والے زمانے میں اردو روزنامہ عصرِ جدید، کلکتہ کا نیوز ایڈیٹر تھا۔ لیکن جس روز یہ دونوں واقعات رونما ہوئے اس روز میں ایک پریس گروپ کے ساتھ بنارس میں تھا، وہاں اسی روز منڈواڈیہہ میں ڈیزل لوکوموٹیو فیکٹری میں تیار کیے ہوئے پہلے ڈیزل انجن کا افتتاح ہونے والا تھا۔ ہم لوگوں کا گروپ بہار میں کئی پروجکٹوں کو کور کرتا ہوا بنارس پہنچا تھا۔ صبح سویرے ناشتے کے بعد ہم لوگوں کو یہ خبریں موصول ہوئیں۔ ٹرین کی ایک اسپیشل بوگی تو بنارس اسٹیشن پر موجود تھی لیکن اس کو دہرہ دون ایکسپریس میں جوڑا جا سکتا تھا جو اگلے دن صبح کو کلکتہ پہنچی۔ تفصیلات اور بھی ہیں لیکن فی الحال ہمیں ان دونوں خبروں کے ڈسپلے سے سروکار ہے۔ میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ ہمارے اخبار نے کیا کیا اور دوسرے اخباروں میں کیا ہوا۔ اب تو مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا تھا، لیکن سمجھا جا سکتا ہے کہ اتنی بڑی خبروں کو کسی نازک صورتِ حال میں برتنا نسبتاً کم تجربہ کار اخبار نویس کے لیے کتنا مشکل ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ اگر اس روز کے دیگر اخباروں سے موازنے اور مقابلے کا سوال ہو تو وہ غریب کہاں ٹھہرے گا۔ غرض یہ کہ اخباروں کا سرسری موازنہ بڑا نازک کام ہے۔ سخت احتیاط اور ہمدردانہ غیر جانبداری کا متقاضی ہے۔

دوسرا واقعہ:

اس دوسری مثال کو دراصل پہلا واقعہ کہنا چاہیے کیونکہ یہ دس برس قبل ۱۹۵۳ء کا ہے۔ غالباً اگست ۱۹۵۳ء کی کوئی تاریخ تھی جب وزیرِ اعظم جموں و کشمیر شیخ محمد عبداللہ کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ میں اس وقت عصرِ جدید میں مترجم تھا (سب ایڈیٹر کہلانے کا اعزاز نہیں حاصل ہوا تھا) بسنت کمار چٹرجی نیوز ایڈیٹر تھے۔ وہ ایک منجھے ہوئے

صحافی تھے۔ اصلاً بنگالی تھے لیکن ان کے والد ریلوے ملازم تھے اور جالندھر میں پوسٹنگ تھی وہیں چڑ جی پلے بڑھے۔ چنانچہ وہ ڈھیلا ڈھالا کرتا پاجامہ پہنتے اور بالکل کھڑی بولی بولتے۔ دہلی کے اردو اخباروں میں ایک عرصہ تک کام کرنے کی وجہ سے زبان کی صحت اور گرامر پر ان کا بڑا اصرار ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ چڑ جی نے شیخ عبداللہ کی معزولی اور نظر بندی کی خبر کو صفحہ اول پر جلی سرخیوں کے ساتھ لگایا۔ اس کی سرخی غالباً تھی ''غدار قوم شیخ عبداللہ گرفتار'' انھوں نے یہ جملہ پارلیمنٹ میں وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے بیان سے لیا تھا (ممکن ہے کچھ لفظی فرق ہو)۔ اخبار عصرِ جدید، خان بہادر شیخ محمد جان صاحب کی ملکیت میں تھا جو کانگریسی ایم ایل سی تھے۔ کلکتہ جمعیۃ العلماء کے صدر تھے لیکن شیخ عبداللہ سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ صبح کو اپنے اخبار میں وہ سرخی دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ چڑ جی دفتر میں طلب کیے گئے اور ان سے جواب طلب کیا گیا۔ ان کا صاف اور سیدھا جواب تھا کہ میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا ہے۔ پنڈت نہرو نے جو کچھ پارلیمنٹ میں کہا میں نے وہی لکھا ہے۔ خان بہادر صاحب کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چڑ جی کو اسی وقت نکال باہر کیا گیا۔ انھوں نے چند روز مفاہمت کی کوشش میں بھاگ دوڑ کی لیکن کوئی سنوائی نہیں ہوئی۔ چڑ جی دہلی واپس چلے گئے اور روزانہ پرتاپ میں کام سے لگ گئے۔ اس کے بعد ان کی کہانی سے ہمیں فی الحال کوئی سروکار نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس معاملے میں چڑ جی کا قصور کیا تھا؟ سارے اخباروں نے بلا استثناء اس خبر کو لیڈ بنایا تھا۔ اگر چڑ جی ایسا نہ کرتے تو کیا مناسب ہوتا؟ کوئی ناقد اگر اس روز کے اخباروں کو اٹھاتا اور عصرِ جدید کو پیچھے پاتا تو اس نقص کا الزام کس پر آتا۔ رات کو جاگنے والے صحافی پر یا اخبار کے مالک پر؟ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اخبار کے سارے معاملات از اول تا آخر بہت نازک ہوتے ہیں اگر ساری چولیں درست ہوں تو بھی کسی ایک چول کا ڈھیلا ہونا سب پر پانی پھیر سکتا ہے لہٰذا اس سلسلے میں تنقید اور تبصرے میں نہایت احتیاط اور توازن اور معروضی رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

تیسرا واقعہ:

۲۵/جون ۱۹۷۵ء۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی کی انتخابی جیت کو ان کے حریف راج نرائن نے چیلنج کیا تھا اس مقدمہ کا فیصلہ ۲۵/جون ۱۹۷۵ء کو اندرا گاندھی کے خلاف آیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد مسز گاندھی کو وزارتِ عظمیٰ سے استعفا دے دینا تھا۔ میں اس زمانے میں آزاد ہند سے وابستہ تھا۔ نیوز ایڈیٹنگ کے علاوہ ایڈیٹوریل بھی لکھا کرتا تھا۔ کبھی ایڈیٹر احمد سعید صاحب خود لکھتے کبھی میں لکھتا۔ اس فیصلے کی خبر آتے ہی سعید صاحب نے ایک زوردار ایڈیٹوریل رقم کیا جس کا عنوان تھا ''اندرا گاندھی کا انڈیا گیٹ''۔ دراصل وہ اشارہ تھا امریکی صدر نکسن کے واٹر گیٹ والے واقعہ کی طرف، نقب زنی کے اس معاملے میں صدر کے ملوث ہونے کی تصدیق کے بعد انھیں قوم سے معافی مانگ کر جان بچانی پڑی تھی۔ ورنہ پارلیمنٹ کی تعزیری کارروائی کا سامنا کرنا پڑتا۔ سعید صاحب نے وہ ایڈیٹوریل لکھنے کے بعد میرے پاس بھیج دیا وہ ہمیشہ ایسا کرتے یہ ان کی صحافتی دیانتداری تھی۔ میں نے اس کو دیکھنے کے بعد کہا کہ سعید صاحب ابھی کوئی نتیجہ اخذ کرنا قبل از وقت ہوگا۔ ابھی وہ وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر بیٹھی ہوئی ہیں، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سعید صاحب نے وہ ایڈیٹوریل فوراً واپس لے لیا اور مجھ سے کہا کہ دوسرا ایڈیٹوریل آپ لکھئے۔ چنانچہ میں نے دوسرا ایڈیٹوریل لکھ دیا۔ اسی روز نصف شب کو ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی۔ اخباروں کے دفتر کی بجلی کاٹ دی

گئی۔ نہ معلوم کتنے صحافی اور سیاسی مخالفین راتوں رات جیل میں ڈال دیے گئے۔ سعید صاحب نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ بال بال بچ گئے۔ یہ واقعہ وہ خود دوسروں کو سناتے رہے۔

سب جانتے ہیں کہ ایمرجنسی کے دوران کیا کیا سختیاں پیش آئیں۔ اگر اس روز سعید صاحب کا لکھا ہوا ایڈیٹوریل چھپ جاتا تو اخبار اور پریس سب اسی وقت بند ہو جانا یقینی تھا۔ کیا ایسے میں اخبار کے قاریوں کا کوئی گروپ سعید صاحب کی مدد اور اعانت کی جسارت کر سکتا تھا۔ ناممکن۔ میری اس دور اندیشی سے اخبار، اسکا ایڈیٹر اور اس کی ملکیت سب بچ گئے۔ کیا کسی کو کبھی اس کی ستائش یا اعتراف کی توفیق ہوئی۔ کبھی نہیں۔ اس نازک اور خطرناک صورتِ حال سے بچ نکلنے کا کریڈٹ جس کو بھی ملنا تھا ملا، جی نہیں۔ لہٰذا اخباری معاملات میں کوئی تجزیہ یا کوئی قطعی رائے قائم کرنا انتہائی احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے۔

ہمارے اردو اخباروں میں یہ بددیانتی عام ہے کہ ایڈیٹوریل لکھنے والے کے دستخط نیچے نہیں ہوتے کہ اس کا کہیں نام نہ ہو جائے۔ پنجاب اور دہلی کے غیر مسلم ملکیت والے اردو اخباروں میں بالعموم ایڈیٹوریل رائٹر کا نام ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اکثر مالک ہی ہوا کرتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ہمارے اردو اخبارات چھوٹے ضرور ہیں لیکن چھوٹا ہونا کوئی عیب تو نہیں۔ اب بھی ان اخباروں میں بڑے اچھے صحافی اور ادیب موجود ہیں جن کی تحریریں چشم کشا ہوتی ہیں، ان اخباروں میں اگر احتجاج کا عنصر ہوتا ہے تو اس سے کسی کا کیا بگڑتا ہے اسی لیے سرکاریں بھی اس پر دھیان نہیں دیتیں۔ اصل کمزوری یہ ہے کہ یہ آمدنی کے وسائل بڑھانے کے لیے وہ کاوشیں نہیں کرتے جو فی زمانہ رائج ہیں۔ اسی طرح اپنے پڑھنے والوں کے حلقے میں وسعت پیدا کرنے کے لیے نہ کوئی مہم چلاتے ہیں نہ کوئی اور کاوش کرتے ہیں گویا سہولت پسند ہیں۔ لکھنے والوں کی پرورش یا حوصلہ افزائی کے لیے بھی کچھ نہیں کرتے بقیہ جو تہمتیں عام طور سے لگائی جاتی ہیں ان کے متعلق صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ...

ایں گنا ہیست کہ در شہر شما نیز کنند